ہو رہا تھا۔

مہتا کو بھی بچے سے محبت ہو گئی تھی۔ ایک روز مالتی نے اسے گود میں لے کر ان کی مونچھیں اکھڑوا لی تھیں۔ ڈشٹ نے مونچھوں کو ایسا پکڑا تھا جیسے جڑ سے اکھاڑ لے گا۔ مہتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور انھوں نے بگڑ کر کہا تھا: "بڑا شیطان لونڈا ہے۔"

مالتی نے انھیں ڈانٹا تھا: "تم مونچھیں صاف کیوں نہیں کر لیتے۔"

"میری مونچھیں مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

"اب کے پکڑے گا تو اکھاڑ ہی کر چھوڑے گا۔"

"میں اس کے کان بھی اکھاڑ لوں گا۔"

منگل کو ان کی مونچھیں اکھاڑنے میں کوئی خاص مزہ آتا تھا۔ وہ خوب کھلکھلا کر ہنستا تھا اور مونچھوں کو زیادہ زور سے کھینچتا تھا۔ مگر مہتا کو بھی شاید مونچھیں اکھڑوانے میں مزہ آتا تھا کیونکہ وہ عموماً دو ایک بار روزانہ اس سے اپنی مونچھوں کی رسہ کشی کرا لیا کرتے تھے۔

ادھر جب سے منگل کو چیچک نکل آئی تھی، مہتا کو بڑی تشویش ہو گئی تھی۔ اکثر کمرے میں جا کر منگل کو مغموم آنکھوں سے دیکھا کرتے۔ اس کی تکلیف کے خیال سے ان کا نرم و نازک دل کانپ جاتا تھا۔ ان کی دوڑ دھوپ سے وہ اچھا ہو جاتا تو وہ زمین کے دوسرے سرے تک بھی دوڑ لگاتے روپے خرچ کرنے سے اچھا ہوتا تو خواہ انھیں بھیک ہی مانگنا پڑتا وہ اسے اچھا کر ہی کے رہتی۔ مگر یہاں کوئی بس نہ تھا۔ اسے چھوتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ لرزتے تھے۔ کہیں اس کے آبلے نہ ٹوٹ جائیں۔ مالتی کتنی آہستگی سے اسے اٹھاتی ہے، کندھے پر بٹھا کر کمرے میں ٹہلتی ہے اور کتنی محبت

محبت سے اسے بہلا کر دودھ پلاتی ہے، یہ مادرانہ محبت مالتی کو ان کی نظروں میں نہ جانے کتنا اونچا اٹھا دیتی ہے۔ مالتی صرف عورت نہیں بلکہ ماں بھی ہے، اور ایسی ویسی ماں نہیں بلکہ اصلی معنی میں ماں، اور دیوی، اور زندگی دینے والی، جو پرائے بچے کو بھی اپنا سمجھ سکتی ہے۔ گویا اس نے مادری جذبات کو سدا سے فراہم کیا ہو اور آج انھیں دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہو! اس کے عضو عضو سے مادریت پھوٹی پڑتی تھی گویا یہ ہی اس کا اصلی روپ ہو۔ وہ ناز و انداز، وہ بناؤ اور سنگار اس کی مادریت کے محض پردے تھے، تاکہ اس کے اندر وہ بوبچی خوب محفوظ رہے۔

رات کو ایک بج گیا تھا۔ منگل کا رونا سن کر مہتا چونک پڑے۔ سوچا بے چاری مالتی آدھی رات تک تو جاگتی رہی ہوگی، اس وقت اسے اٹھنے میں کتنی تکلیف ہوگی، پس اگر دروازہ کھلا ہو تو میں خود ہی بچے کو چپ کرا دوں وہ فوراً اٹھ کر اس کمرے کے دروازے پر گئے اور شیشے سے اندر جھانکا مالتی بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور بچہ یوں ہی رو رہا تھا۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا، یا کسی اور وجہ سے ڈر گیا تھا۔ مالتی پچکارتی تھی تھپکتی تھی، تصویریں دکھاتی تھی، گود میں لے کر ٹہلتی تھی، مگر بچہ چپ نہ ہوتا تھا مالتی کی یہ بے حد محبت اور لاڈلی مادریت دیکھ کر ان کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ دل میں ایسی گدگدی اٹھی کہ اندر جا کر مالتی کے پیروں پر سر رکھ دیں۔ دل سے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا ایک ہجوم نکل پڑا۔

پیاری، میرے بہشت کی دیوی، میری رانی ....."

اور اسی مجنونانہ محبت میں وہ پکار اٹھے "مالتی ذرا دروازہ کھول دو۔"

مالتی نے آکر دروازہ کھولا اور ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مہتا نے پوچھا: "کیا جھنیا نہیں اٹھی؟ یہ تو بہت رو رہا ہے؟"

مالتی نے تکلیف کے لہجے میں کہا: "آج آٹھواں دن ہے، درد زیادہ ہوگا۔ اسی سے۔"

"تو لاؤ، میں کچھ دیر ٹہلا دوں، تم تھک گئی ہوگی۔"

مالتی نے مسکرا کر کہا: "تمھیں ذرا ہی دیر میں غصہ آجائے گا۔"

بات سچ تھی، مگر اپنی کمزوری کون تسلیم کرتا ہے؟ مہتا نے ضد سے کہا: "تم نے مجھے اتنا سبک سمجھ رکھا ہے۔"

مالتی نے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔ ان کی گود میں جاتے ہی وہ یک دم چُپ ہوگیا۔ بچوں میں جو ایک فطری سمجھ ہوتی ہے اسی نے اس کو بتایا کہ رونے میں اب تمھارا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ نیا آدمی عورت نہیں بلکہ مرد ہے اور مرد غصہ ور ہوتا ہے اور بے رحم بھی ہوتا ہے، اور چارپائی پر لٹا کر یا باہر اندھیرے میں ڈال کر وہ دور بھی چلا جا سکتا ہے اور کسی کو پاس آنے بھی نہ دے گا۔

مہتا نے فخریہ کہا: "دیکھا، کیسا چپ کر دیا۔"

مالتی نے مذاق کیا: "ہاں، تم اس فن میں بھی طاق ہو۔ کہاں سیکھا؟"

"تم سے۔"

"میں عورت ہوں اور مجھ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

مہتا نے شرم سے کہا: "مالتی، میں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ

اب میری ان باتوں کو بھول جاؤ۔ ان کئی مہینوں میں کتنا پچھتایا ہوں، کتنا نادم اور ملول ہوا ہوں، اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو گی۔"

مالتی نے سادگی سے کہا: "میں تو بھول گئی۔ سچ کہتی ہوں۔"

"مجھے کیسے یقین آئے؟"

"اس کا ثبوت یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں ایک ہی ساتھ کھاتے ہیں، ہنستے ہیں، بولتے ہیں۔"

"کیا مجھے کچھ مانگنے کی اجازت نہ دو گی؟"

انھوں نے منگل کو چارپائی پر لٹا دیا جہاں وہ مسکرا کر سو رہا اور مالتی کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا گویا اسی اجازت پر ان کا پورا دار و مدار ہو۔

مالتی نے متاثر ہو کر کہا: "تم جانتے ہو کہ تم سے زیادہ قریبی دنیا میں میرا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ میں نے بہت دن ہوئے کہ خود کو تمھارے چرنوں کی بھینٹ کر دیا ہے، تم میرے رہنما ہو، میرے دیوتا ہو، میرے استاد ہو۔ تمھیں مجھ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں، صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ جب تک مجھے تمھارے درشن نہ ہوئے تھے اور میں نے تمھیں پہچانا نہ تھا اس وقت تک عیش اور خود پروری ہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ تم نے آکر اسے تحریک دی، بیداری دی۔ میں تمھارا احسان کبھی بھول نہیں سکتی۔ میں نے ندی کے کنارے والی تمھاری باتیں گرہ کر لیں۔ رنج یہی ہوا کہ تم نے بھی مجھے وہی سمجھا جو دوسرا مرد سمجھتا اور جس کی امید مجھے تم سے نہ تھی۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، یہ میں جانتی ہوں، مگر میں تمھاری گرانبہا محبت پا کر بھی وہی بنی رہوں گی۔ ایسا سمجھ کر تم نے

ے ساتھ بے انصافی کی، میں اس وقت کتنے غرور کا احساس کر رہی
ں، یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ تمھارا عشق اور اعتماد پا کر اب میرے لئے کچھ
ی نہیں رہا۔ یہ برکت میری زندگی بامعنی بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ یہی
ی تکمیل ہے؟"

یہ کہتے تھے مالتی کے دل میں ایسی رغبت پیدا ہوئی کہ مہتا کے سینے
لپٹ جائے۔ اندر کی خواہشیں باہر آ کر گویا سچ ہو گئی تھیں۔ اس کا رویاں
دیاں پھول اٹھا۔ جس سرور کو اس نے نایاب سمجھ رکھا تھا وہ اتنا قابل حصول
ور اتنا قریب ہے! اور دل کا وہ سرور چہرے پر آ کر اسے ایسی رونق دینے
لگا کہ مہتا کو اس میں دیوتا پن کی سی جھلک دکھائی پڑی۔ یہ عورت ہے یا
خیر اور پاکیزگی اور ایثار کی مجسم مورت!

اسی وقت جھنیا جاگ کر اٹھ بیٹھی اور مہتا اپنے کمرے میں چلے گئے
اور پھر دو ہفتے تک مالتی سے کچھ بات چیت کرنے کا موقع انہیں نہ ملا۔ مالتی
ان سے تنہائی میں نہ ملتی۔ مالتی کے وہ الفاظ ان کے دل میں گونجتے
رہتے۔ ان میں کتنی تشفی تھی، کتنی عاجزی تھی، کتنا نشا تھا!

دو ہفتے میں منگل اچھا ہو گیا۔ البتہ منہ پر کے داغ نہ بھر سکے۔ اس دن
مالتی نے پڑوس کے دو لڑکوں کو خوب مٹھائی کھلائی اور جو منتیں کر رکھی تھیں
وہ بھی پوری کیں۔ قربانی کی زندگی میں کتنی خوشی ہے۔ اس کا اب اسے تجربہ
ہو رہا تھا۔ جھنیا اور گوہر کی خوشی گویا اس کے دل میں منعکس ہو رہی تھی۔ دوسروں
کی تکلیف دور کرنے میں اس نے جو خوشی محسوس کی وہ کبھی عیش و آرام کی
زندگی میں نہ ملی تھی۔ وہ ہوس اب ان پھولوں کی طرح کمزور ہو گئی تھی جن
میں پھل لگ رہے ہوں۔ اب وہ اس درجے سے آگے نکل چکی تھی جب

انسان مادی خوشی کو اصلی خوشی سمجھتا ہے۔ وہ خوشی اب اسے ہیچ اور پست کی طرف لے جانے والی، اور ہلکی بلکہ بھیانک سی لگتی تھی۔ اس بڑے محل میں رہنے کا کیا لطف جب اس کے آس پاس مٹی کے جھونپڑے گویا فریاد کر رہے ہوں؟ موٹر پر چڑھ کر اب اسے فخر نہیں ہوتا۔ منگل جیسے نادان بچے نے اس کی زندگی کو کتنا منور کر دیا تھا۔ اس کے لئے حقیقی خوشی کا در وا کھول دیا تھا!

ایک روز مہتا کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند ہوئے پلنگ پر پڑے تڑپ رہے تھے کہ مالتی نے آکر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: "یہ درد کب سے ہو رہا ہے؟"

مہتا کو ایسا معلوم ہوا کہ ان نرم و نازک ہاتھوں نے سارا درد کھینچ لیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے: "درد تو دو پہر ہی سے ہو رہا ہے اور ایسا درد مجھے آج تک نہیں ہوا تھا۔ مگر تمہارے ہاتھ رکھتے ہی سر ایسا ہلکا ہو گیا ہے گویا درد تھا ہی نہیں، تمہارے ہاتھوں میں شفا ہے۔"

مالتی نے انھیں کوئی دوا لا کر کھانے کو دے دی اور آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کر کے فوراً ہی کمرے سے نکل جانے کو ہوئی کہ مہتا نے اصرار سے کہا: "دو منٹ بیٹھو گی نہیں؟"

مالتی نے دروازے پر سے مڑ کر کہا: "اس وقت باتیں کرو گے تو شاید پھر درد ہونے لگے۔ آرام سے لیٹے رہو۔ آج کل میں تمھیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتے یا لکھتے دیکھتی ہوں۔ دو چار دن پڑھنا لکھنا بند کر دو۔"

"تم ایک منٹ بیٹھو گی نہیں؟"

"مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔"

اچھی بات ہے جاؤ۔"

مہتا کے چہرے پر کچھ ایسی اداسی چھا گئی کہ مالتی لوٹ پڑی اور سامنے آکر بولی: "اچھا کہو، کیا کہتے ہو؟" مہتا نے بے دلی سے کہا: "کوئی خاص بات نہیں یہی کہہ رہا تھا کہ اتنی رات گئے کس مریض کو دیکھنے جاؤ گی؟" "وہی رائے صاحب کی لڑکی ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، مگر اب کچھ سنبھل گئی ہے۔"

اس کے جاتے ہی مہتا پھر لیٹ رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مالتی کے ہاتھ رکھتے ہی درد کیوں رفع ہو گیا۔ ضرور اس میں کوئی عجیب طاقت ہے، اور یہ اس کی ریاضت، اس کی عملی انسانیت ہی کی برکت ہے۔ مالتی نسائیت کے اس بلند معیار پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ نور کے ایک ستارے کی طرح روشن نظر آتی تھی۔ اب وہ عشق کی چیز نہیں، عقیدت کی چیز تھی۔ اب وہ نایاب ہو گئی تھی اور ایسا ہونا فہم و فراست والوں کے لئے سعی و کوشش کرنے کا ایک منتر ہے۔ مہتا عشق میں جس خوشی کا تصور کر رہے تھے اسے عقیدت نے اور بھی گہرائی اور جانداری دے دی تھی۔ عشق میں کچھ گھمنڈ بھی ہوتا ہے اور کچھ لگاؤ بھی، مگر عقیدت تو خود کو فنا کر دینی ہے اور اپنی اس فنا ہی کو اپنا اعلیٰ مقصد بنا لیتی ہے۔ عشق اقتدار جمانا چاہتا ہے، جو کچھ دیتا ہے اس کے عوض میں کچھ چاہتا ہے، مگر عقیدت کی انتہائی خوشی نجی قربانی میں ہے جس میں خودی کا فقدان ہو جاتا ہے!

مہتا کی وہ بڑی کتاب ختم ہو گئی تھی جسے وہ تین سال سے لکھ رہے تھے اور جس میں انھوں نے دنیا کے سب ہی فلسفیانہ اجزا کو شامل کیا تھا۔ یہ کتاب انھوں نے مالتی کے نام معنون کی اور جس دن اس کی جلدیں انگلستان سے آئیں اور انھوں نے ایک جلد مالتی کی نذر کی تو وہ اسے اس طرح معنون دیکھ کر متعجب بھی ہوئی اور مغموم بھی۔

اُس نے کہا: "یہ تم نے کیا کیا؟ میں تو اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی۔"
مہتا نے فخریہ کہا: "مگر میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تو کوئی چیز نہیں، مجھ میں تو اگر سو جانیں ہوتیں تو وہ سب تمھارے قدموں پر نثار کر دیتا۔"
"مجھ پر! جس نے خود غرضی کے سوا کچھ اور جانا ہی نہیں۔"
"تمھارے تیاگ کا ایک ٹکڑا بھی میں پا جاتا تو خود کو خود نصیب سمجھتا۔ تم دیوی ہو۔"
"پتھر کی، اتنا اور کیوں نہیں کہتے؟"
"قربانی کی، راحت کی، پاکیزگی کی!"
تب تم نے مجھے خوب سمجھا۔ میں اور تیاگ! میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ سیوا یا تیاگ کا خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں وہ پوشیدہ یا علانیہ غرض کے لئے کرتی ہوں۔ میں گاتی اس لئے نہیں کہ تیاگ کرتی ہوں یا اپنے گیتوں سے غمزدوں کو تسکین دیتی ہوں، بلکہ صرف اس لئے کہ اس سے میرا دل خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح دوا بھی غریبوں کو دے دیتی ہوں، صرف اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے۔ شاید دل کی خودی اس میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ تم مجھے خواہ مخواہ دیوی بنائے ڈالتے ہو۔ اب تو اتنی ہی کسر رہ گئی ہے کہ آرتی اور چڑھاوا وغیرہ لے کر میری پوجا کرو۔"
مہتا بولے: "وہ تو میں برسوں سے کر رہا ہوں مالتی، اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک بردان نہ مل جائے گا۔"
مالتی نے چٹکی لی: "تو بردان پا جانے کے بعد شاید دیوی کو مندر سے نکال پھینکو۔"
مہتا نے سنبھل کر کہا: "تب تو میری جداگانہ ہستی ہی نہ رہے گی عابد

معبود میں جذب ہو جائے گا۔"

مالتی نے سنجیدگی سے کہا: "نہیں مہتا، میں مہینوں سے اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں اور آخر میں میں نے یہ طے کیا ہے کہ دوست بن کر رہنا زن و شوہر بن کر رہنے سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھ پر اعتبار کرتے ہو، اور مجھے بھروسہ ہے کہ آج موقع آپڑے تو تم اپنی جان دے کر بھی میری حفاظت کرو گے۔ تم میں میں نے اپنا ہادی ہی نہیں بلکہ اپنا محافظ بھی پایا ہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور تم پر اعتبار کرتی ہوں اور تمھارے لئے کوئی ایسی قربانی نہیں جو میں نہ کر سکوں۔ ایشور سے میری یہی بنتی ہے کہ وہ زندگی بھر مجھے اسی راہ پر قائم رکھے۔ ہماری تکمیل کے لئے ہمارے روحانی ارتقاء کے لئے اور کیا چاہیئے؟ اپنی چھوٹی سی گرہستی بنا کر، اپنی روحوں کو چھوٹے سے پنجرے میں بند کر کے، اپنے سکھ دکھ کو اپنے ہی تک رکھ کر، کیا ہم لامحدود کے قریب تک پہنچ سکتے ہیں؟ ویسا کرنا تو ہماری راہ میں رکاوٹ ہی ڈالے گا۔ معدودے چند آدمی ایسے بھی ہیں جو پیروں میں بیڑیاں ڈال کر بھی ارتقائی راستے پر چل سکتے ہیں اور چل رہے ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تکمیل کے لئے اس محبت اور ترک و ایثار میں بڑی اہمیت ہے جو کہنے کے لئے کئے جاتے ہیں لیکن میں اپنے دل کو اتنا مضبوط و مستقل نہیں پاتی۔ جب تک محبت نہیں ہے، خودی نہیں ہے۔ اس وقت تک زندگی کا لالچ نہیں ہے، خود غرضی کا زور نہیں ہے جس روز دل لالچ میں پڑا اور ہمارے لئے بندش تیار ہو گئی۔ اسی وقت ہماری انسانیت کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ نئی نئی ذمہ داریاں ہوں گی اور ہماری ساری طاقت ان ہی کے پورا کرنے میں لگنا شروع ہو جائے گی،

تم جیسے طبّاع و دانشمند انسان کی روح کو میں اس قید میں بند نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی تک تمھاری زندگی ایک یگیہ تھی جس میں خود غرضی کے لئے بہت کم گنجائش تھی۔ میں اس کو پستی کی طرف نہ لے جاؤں گی۔ دنیا کو تم جیسے مرتاضوں کی ضرورت ہے۔ جو اپنے دل کو اتنا وسیع بنا دیں کہ ساری دنیا ان کی اپنی ہو جائے۔ دنیا میں بے انصافی کی، ظلم کی اور خوف کی دُہائی مچی ہوئی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا، مذہبی مکاری کا اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ تم نے وہ پکار سنی ہے۔ تم بھی نہ سنو گے تو سننے والے آئیں گے کہاں سے؟ دوسرے ظاہری انسانوں کی طرح تم بھی اس کی طرف سے اپنے کان نہیں بند کر سکتے۔ تمھیں ویسی زندگی ہی وبال ہو جائے گی اپنے علم اور اپنی عقل کو، اپنی بیدار انسانیت کو زیادہ حوصلہ اور زور کے ساتھ اسی راستے پر لے جاؤ۔ میں بھی تمھارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ اپنی زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی سنبھال کر دو، تم سے میرا یہی کہنا ہے اگر تمھارا دل دنیویت کی طرف دوڑتا ہے، جب بھی میں اپنا بس چلنے تمھیں ادھر سے ہٹاؤں گی اور الیشور نہ کرے کہ مجھے اپنے اس ارادے میں ناکامیاب ہونا پڑے لیکن اس حالت میں میں دو بوند آنسو گرا کر تمھارا ساتھ چھوڑ دوں گی اور کہہ نہیں سکتی کہ پھر میرا کیا انجام ہوگا، میں کس گھاٹ لگوں گی۔ مگر چاہے وہ کوئی گھاٹ ہو پھر بھی اس دنیوی بندش کا گھاٹ نہ ہوگا۔ بولو، مجھے کیا حکم دیتے ہو؟"

مہتا سر جھکائے سنتے رہے۔ ایک ایک لفظ گویا ان کے دل کی آنکھیں اس طرح کھولے دیتا تھا جیسے اب تک کبھی نہ کھلی تھیں۔ وہ خیالات جو اب تک ان کے سامنے خواب کی تصویروں کی طرح آئے تھے اب زندگی کی سچائیوں سے معمور ہو کر متحرک ہو رہے تھے۔ وہ اپنے روئیں روئیں میں روشنی اور ترقی کا احساس کر رہے تھے۔ زندگی کے بڑے ارادوں کے سامنے ہمارا

پن ہماری آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔ مہتا کی آنکھوں میں بھی میٹھی یاد والا بچپن پھر جب وہ اپنی بیوہ ماں کی گود میں بیٹھ کر بہت بڑے سکھ کا احساس کیا کرتے تھے۔ کہاں ہے وہ ماں؟ آئیے اور دیکھئے اپنے بیٹے کی اس شہرت و نیکنامی کو! مجھے دعا دو۔ تمھارا وہ ہٹی لڑکا آج ایک نیا جنم لے رہا ہے!

انھوں نے ماتی کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لئے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے: "تمھارا حکم منظور ہے، ماتی!"

اور دونوں ایک سے دل والے ہو کر باہم بغلگیر ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

(۳۴)

سلیاؔ کا لڑکا اب دو سال کا ہو رہا تھا اور سارے گانوں کی دوڑ لگا تا تھا اپنے ساتھ ایک عجیب بولی لایا تھا اور اسی میں بولتا تھا، خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اس کی بولی میں ٹ، ل اور گھ کی کثرت تھی اور س، ر وغیرہ غائب تھے۔ اُس بولی میں روٹی کا نام تھا آوٹی، دودھ کا توت، ساگ کا چھاگ اور کوڑی کا تولی جانوروں کی بولیوں کی ایسی نقل کرتا ہے کہ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا "رامو، کتا کیسے بولتا ہے؟" تو رامو سنجیدگی سے کہتا "بھوں بھوں، اور کاٹنے دوڑتا۔ بلی کیسے بولے؟ اور رامو میاؤں میاؤں" کرکے آنکھیں نکال کر، تاکتا اور پنجوں سے نوچتا۔ بڑا مست لڑکا تھا۔ جب دیکھو کھیلنے میں مگن رہتا، کھانے پینے کی سدھ نہ تھی۔ گود سے اسے چڑھ تھی اس کی سب سے بڑی خوشی کے لمحے وہ ہوتے جب وہ دروازے پر نیم کے نیچے منوں دھول اکٹھا کرکے اس میں لوٹتا، اُسے سر پر چڑھاتا، اس کی ڈھیریاں لگاتا، اس کے گھروندے بناتا۔ اپنے ہم عمروں سے اُس کی ایک لمحہ بھی نہ پٹتی۔ وہ شاید ان کو اپنے ساتھ کھیلنے کے قابل ہی نہ سمجھتا تھا۔

کوئی پوچھتا: "تمھارا کیا نام ہے؟"

فوراً کہتا: "لامو۔"

"تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"مانادین۔"

"اور تمھاری ماں کا؟"

"چھلیا۔"

"اور ماتا دین کون ہے؟"

"وہ اما لا چھالا ہے۔"

نہ جانے کس نے ماتا دین سے اس کا یہ رشتہ بتا دیا تھا۔

رامو اور رُدیا میں خوب بنتی تھی وہ رُدیا کا کھلونا تھا۔ اسے اُبٹن ملتی، کاجل لگاتی، نہلاتی، بال سنوارتی اور اپنے ہاتھوں لقمے بنا بنا کر کھلاتی اور کبھی کبھی لے گود میں لئے رات کو سو بھی جاتی۔ دھنیا ڈانٹتی کہ تو سب چھوا چھوت کئے دیتی ہے مگر وہ کسی کی نہ سنتی۔ چیتھڑے کی گڑیوں نے اسے ماں بننا سکھایا تھا۔ وہ مادرانہ جذبہ جیتا جاگتا بچہ پا کر اب گڑیوں سے مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔

ہوری کے گھر کے پچھواڑے جس مکان میں کسی وقت اس کے بیل بندھتے تھے اسی کے کھنڈر میں سلیا اپنا ایک پھوس کا جھونپڑا ڈال کر رہنے لگی تھی۔ ہوری کے گھر میں عمر تو نہیں کٹ سکتی تھی۔

ماتا دین کو کئی سو روپئے خرچ کرنے کے بعد اخیر میں کاشی کے پنڈتوں نے پھر برہمن بنا دیا تھا۔ اس روز بڑا بھاری ہوم ہوا، بہت سے برہمنوں نے کھانا کھایا اور بہت سے منتر اور اشلوک پڑھے گئے۔ ماتا دین کو شدھ گوبر اور گوموتر کھانا پینا پڑا۔ گوبر سے اس کا دل پاک ہو گیا اور گوموتر سے اس کی روح کے ناپاک جراثیم ہلاک ہو گئے۔

لیکن ایک طرح سے اس پرایسچت نے اسے سچ مچ پوتر کر دیا۔ ہوم کے جلتے ہوئے کنڈ میں اس کی بشریت نکھر گئی۔ اور ہوم کے شعلوں کی روشنی میں اس نے مذہبی ارکان کو اچھی طرح پرکھ لیا اس دن سے اُسے دھرم کے نام سے چڑھ ہو گئی۔ اُس نے جنیو اتار کر پھینک دیا اور پروہتی کو گنگا میں ڈبو دیا۔

اب وہ پکا کسان تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اگرچہ علماء نے اس کا برہمن ہونا تسلیم کر لیا لیکن لوگ اب بھی اس کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے۔ اس سے مہورت پوچھتے ہیں ساعت اور لگن کا بچار کراتے ہیں۔ اسے تیوہار کے موقعوں پر دان دکشنا بھی دیتے ہیں مگر اپنے برتن نہیں چھونے دیتے۔

جس دن سلیا کے بچہ پیدا ہوا۔ اس نے دگنی مقدار میں بھنگ پی اور گھمنڈ سے جیسے اس کا سینہ تن گیا اور انگلیاں بار بار مونچھوں پر پڑنے لگیں۔ بچہ کیسا ہوگا؟ اسی کا سا؟ کیسے دیکھیں؟ اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔

تیسرے دن روپا کھیت میں اس سے ملی تو اس نے پوچھا: "روپیا تو نے سلیا کا لڑکا دیکھا؟"

روپیا بولی: "دیکھا کیوں نہیں؟ لال لال ہے، کھوب (خوب) موٹا، بڑی بڑی آنکھیں ہیں، سر میں جھبرالے بال ہیں، ٹکر ٹکر تاکتا ہے۔"

ماتادین کے دل میں جیسے وہ لڑکا آ بیٹھا تھا اور ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔ اس نے اس بچی کو گود میں اٹھا لیا، پھر کندھے پر بٹھا لیا اور پھر کندھے سے اتار کر اس کے گالوں کو چوم لیا۔

روپا بال سنبھالتی ہوئی ڈھیٹ ہو کر بولی: "چلو، میں تم کو دور سے دکھا دوں دالان ہی میں تو ہے، سلیا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے۔"

ماتادین نے منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

اس رات کو جب سارا گاؤں سو گیا اور پیڑ تاریکی میں سما گئے تو وہ سلیا کے دروازے پر آیا اور پوری توجہ سے بچے کا رونا سنا جس میں ساری دنیا کی موسیقیت، مسرت اور حلاوت بھری ہوئی تھی۔

سلیا بچے کو ہوری کے مکان میں کھٹولے پر سُلا کر مزدوری کرنے چلی جاتی تو ماتادین کسی نہ کسی بہانے سے ہوری کے گھر آتا اور کنکھیوں سے بچے کو دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا۔

دھنیا مسکرا کر کہتی "لجاتے کیوں ہو؟ گود میں لے لو، پیار کرو! کیسا کاٹھ کا کلیجہ ہے تمھارا؟ بالکل تم پر پڑا ہے۔"

ماتادین دو ایک روپئے سلیا کے لئے پھینک کر باہر نکل آتا۔ بچّے کے ساتھ اس کی روح میں بھی بالیدگی، شگفتگی اور چمک آرہی تھی۔ اب اس کی زندگی کا بھی ایک ہی مقصد تھا، ایک ہی عہد تھا۔ اس میں باقاعدگی آگئی، سنجیدگی آگئی، ذمہ داری آگئی!

ایک دن رامو کھٹولے پر لیٹا ہوا تھا۔ دھنیا کہیں گئی تھی۔ روپا بھی لڑکوں کا شور وغل سن کر کھیلنے چلی گئی تھی۔ گھر سونا تھا۔ اسی وقت ماتادین پہنچا۔ بچّہ نیلے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا، ہمک رہا تھا۔ زندگی کی اس خوشی کے ساتھ جو ابھی اس میں تازہ تھی۔ ماتادین کو دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ ماتادین محبت سے بے چین ہو گیا۔ اس نے بچّے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا دل اور سارا بدن خوشی سے کانپ اٹھا، گویا پانی کی لہروں میں نور کی شعاعیں کانپ رہی ہوں۔ بچّہ کی گہری، صاف، اتھاہ خوشی بھری آنکھوں میں گویا اس کی زندگی کی سچائی مل گئی، اسے ایک طرح کا ڈر سا لگا گویا وہ نگاہیں اس کے دل میں کھبی جاتی ہوں، وہ کتنا ناپاک ہے! ایشور کی اس دین کو کیسے چھو سکتا ہے؟ اس نے بچّے کو خوف بھرے دل کے ساتھ پھر لٹا دیا۔ اسی وقت روپا باہر سے آگئی اور وہ باہر نکل گیا۔

ایک دن خوب اولے پڑے۔ سلیا گھاس لے کر بازار گئی ہوئی تھی اور

رو پا اپنے کھیل میں مگن تھی۔ رامو نے آنگن میں بنولے بچھے دیکھے تو سمجھا کہ بتاشے پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی بنولے اٹھا کر کھائے اور آنگن میں خوب کھیلا رات کو اسے بخار آگیا اور دوسرے دن نمونیا ہو گیا اور تیسرے دن شام کو سلیا کی گود میں بچے کی روح پرواز کر گئی۔

لیکن بچہ مر کر بھی سلیا کی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس کے سینے میں دودھ کا ابال سا آتا اور آنچل تر ہو جاتا۔ اسی وقت آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو جاتے پہلے سب کاموں سے فراغت پا کر رات کو جب وہ رامو کو سینے سے لگا کر اس کے منہ میں دودھ ڈالتی تو گویا اس کا دل بچے کی تازگی سے بھر جاتا۔ تب وہ پیارے پیارے گیت گاتی اور میٹھے میٹھے سپنے دیکھتی۔ اور نئی نئی دنیا بناتی جس کا راجہ رامو ہوتا۔ اب سب کاموں سے فرصت پا کر وہ اپنی سونی جھونپڑی میں روتی، اور اس کی روح تڑپتی رہتی تھی، اڑ جانے کے لئے اس لوک میں جہاں اس کی گودی کا لال اس وقت بھی کھیل رہا ہوگا! اس کے غم میں کل گاؤں شریک تھا۔ رامو کتنا چلبلا تھا، جو کوئی بلاتا اسی کی گود میں چلا جاتا۔ مر کر اور پہنچ سے باہر ہو کر وہ اب اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ اس کا عکس اسے کہیں زیادہ سندر، چلبلا اور لبھاؤنا تھا!

ماتا دین اس دن کھل پڑا۔ پردہ ہوتا ہے ہوا کے لئے۔ آندھی میں پردے اٹھا کر رکھ دئیے جاتے ہیں کہ آندھی کے ساتھ اڑ نہ جائیں۔ اس نے لاش کو دونوں ہتھیلیوں پر اٹھا لیا اور تنہا ندی کے کنارے تک لے گیا جو ایک میل کا پاٹ چھوڑ کر ایک پتلی سی دھار میں سما گئی تھی۔ آٹھ روز تک اس کی ہاتھ سیدھے نہ ہو سکے۔ اس دن وہ ذرا بھی نہ شرمایا، ذرا بھی نہ جھجکا۔

اور کسی نے کچھ کہا بھی نہیں، بلکہ سب نے اس کی ہمت اور استقلال

کی تعریف کی۔

ہوری نے کہا: "یہی مرد کا دھرم ہے۔ جس کی باہنہ پکڑی اسے کیا چھوڑنا۔"

دھنیا نے آنکھیں نچا کر کہا: "مت بکھان کرو، جی جلتا ہے۔ وہ مرد ہے میں تو ایسے مرد کو نامرد کہتی ہوں۔ جب باہنہ پکڑی تھی تب کیا دودھ پیتا تھا کہ سلیا باھنی ہوگئی تھی؟"

ایک مہینہ بیت گیا۔ سلیا پھر مزدوری کرنے لگی تھی۔ شام ہوگئی تھی۔ پورنماسی کا چاند ہنستا ہوا نکل آیا تھا۔ سلیا نے کٹے ہوئے کھیت میں سے گرے ہوئے جو کے خوشے چن کر ٹوکری میں رکھ لئے تھے اور گھر جانا چاہتی تھی کہ چاند پر نظر پڑ گئی اور درد بھری یاد کا جیسے سوتھ سا کھل گیا۔ آنچل دودھ سے بھیگ گیا اور چہرہ آنسوؤں سے۔ اس نے سر جھکا لیا اور گویا رونے کا لطف اٹھانے لگی۔

دفعتاً کسی کی آہٹ پا کر چونک پڑی۔ مانا دین پیچھے سے آکر سامنے کھڑا ہوگیا اور بولا: "کب تک روئے جائے گی سلیا؟ رونے سے وہ پھر تو نہ آجائیگا اور یہ کہتے کہتے وہ خود رو پڑا۔

سلیا کے منہ میں آئے ہوئے شکوے کے الفاظ گھل گئے۔ آواز سنبھال کر بولی: "تم آج ادھر کیسے آگئے؟"

مانا دین نے رنجیدہ ہو کر کہا: "ادھر سے جا رہا تھا، تجھے بیٹھے دیکھا تو چلا آیا۔"

"تم تو اسے کھلا بھی نہ پائے۔"

"نہیں سلیا، ایک دن کھلا آیا تھا۔"

"سچ۔"

"سچ!"

"میں کہاں تھی؟"

"تو ہاٹ گئی تھی۔"

"تمھاری گود میں رویا نہیں؟"

"نہیں سلیا ہنستا تھا۔"

"سچ؟"

"سچ!"

"بس ایک ہی دن کھلایا؟"

"ہاں ایک ہی دن۔ مگر دیکھنے نت آتا تھا۔ اسے کھٹولے پر کھیلتے دیکھتا تھا اور دل تھام کر چلا جاتا تھا۔"

مجھے تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ ناحق (ناحق) اس دن اسے گود میں لیا یہ میرے پاپوں کا ڈنڈ ہے۔"

سلیا کی آنکھوں میں عفو جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹوکری سر پر رکھ لی اور گھر چلی۔ ماتا دین بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

سلیا نے کہا "میں تو اب دھنیا کاکی کے بردھٹے میں سوتی ہوں، اپنے گھر میں اچھا نہیں لگتا۔"

"دھنیا مجھے برابر سمجھاتی رہتی تھی۔"

"سچ۔"

"ہاں، سچ! جب ملتی تھی سمجھانے لگتی تھی۔"

گاؤں کے قریب جا کر سلیا نے کہا "اچھا، اب ادھر سے اپنے گھر چلے جاؤ۔ کہیں پنڈت دیکھ نہ لیں۔"

ماتا دین نے گردن اٹھا کر کہا "میں اب کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"گھر سے نکال دیں گے تو کہاں جاؤ گے؟"

"میں نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔"

"سچ؟"

"ہاں سچ!"

"کہاں؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"چل تو، دکھاتا ہوں۔"

دونوں اور آگے بڑھے۔ ماتا دین آگے تھا اور سلیا پیچھے۔ ہوری کا گھر آگیا۔ ماتا دین اسی کے پچھواڑے جا کر سلیا کی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا: "یہی میرا گھر ہے!"

سلیا نے بے اعتباری، عفو، طنز اور درد سے بھرے لہجے میں کہا "یہ تو سلیا چمارن کا گھر ہے۔"

ماتا دین نے دروازے کی ٹٹی کھولتے ہوئے کہا: "یہ میری دیوی کا مندر ہے۔"

سلیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بولی: "مندر ہے تو ایک لوٹا پانی انڈیل کر چلے جاؤ گے۔"

ماتا دین نے اس کے سر کی ٹوکری اتارتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "نہیں سلیا، جب تک جان ہے تیری سرن (پناہ) میں رہوں گا اور تیری ہی پوجا کروں گا۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"نہیں، تیرے چرن چھو کر کہتا ہوں۔ سنا کہ پٹواری کا لونڈا بھنیسری

تیرے پیچھے بہت پڑا تھا۔ تو نے اسے کھوب (خوب) ڈانٹا۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"بھنیسری آپ ہی کہتا تھا۔"

"سچ؟"

"ہاں سچ!"

سلیا نے دیا سلائی سے کپی جلائی۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا تھا۔ اور دوسری طرف چولھا، جہاں دو تین پیتل اور لوہے کے برتن صاف کئے ہوئے رکھے تھے۔ درمیان میں پوال بچھا ہوا تھا۔ وہی سلیا کا بستر تھا۔ اس بستر کے سرہانے رآمو کا چھوٹا سا گھٹو لا پڑا ہوا گویا رو رہا تھا اور اسی کے پاس دو تین مٹی کے ہاتھی گھوڑے ٹوٹی ہوئی حالت میں پڑے تھے۔ جب مالک ہی نہ رہا تو کون ان کی دیکھ بھال کرتا؟ ماتا دین پوال پر بیٹھ گیا۔ دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب روئے۔

سلیا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا: "تمھیں کبھی میری یاد آتی تھی؟"

ماتا دین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا: "تو ہر دم میری آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔ تو بھی کبھی مجھے یاد کرتی تھی؟"

"میرا تو تم سے جی جلتا تھا۔"

"اور دیا نہیں آتی تھی؟"

"کبھی نہیں۔"

"تو بھنیسری ....."

"اچھا گالی مت دو۔ میں ڈر رہی ہوں کہ گانوں والے کیا کہیں گے۔"

"جو بھلے آدمی ہیں وہ کہیں گے کہ یہی ان کا دھرم تھا۔ جو بُرے ہیں